نجم الدین اربکانؒ

سید سعادت اللہ حسینی

(حیدرآباد میں ایک تعزیتی نشست میں کی گئی تقریر)

نجم الدین اربکان کا بزم دنیا سے رخصت ہو جانا ایک بڑا حادثہ ہے۔ مرحوم بلا شبہ ایک عہد ساز شخصیت تھے اور ہماری جدید تاریخ کے بڑے محسنوں میں سے ایک تھے۔ آپ لوگوں نے ان کے جنازے کا منظر دیکھا ہوگا کہ پوری اسلامی دنیا نے کس محبت اور جذبات کی کس شدت کے ساتھ انہیں ان کے آخری سفر پر رخصت کیا۔ یہ اس غیر معمولی مقبولیت کی علامت ہے جو انہیں اسلامی دنیا میں حاصل تھی اور ان گہرے اثرات کی بھی علامت ہے جو مرحوم نے اپنی انتھک جدوجہد سے اسلامی دنیا پر مرتب کئے۔

علامہ اقبال کی ایک مشہور نظم ہے 'طلوع اسلام'۔ اس میں علامہ نے ساری دنیا میں اسلام کے طلوع ہونے اور غالب ہونے کے آثار کو بہت خوبصورت انداز میں نظم کی صورت میں بیان کیا ہے۔ غلبۂ اسلام کی مختلف علامتیں بیان کرتے ہوئے شاعر مشرق کہتے ہیں:

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

علامہ کی پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ بیسویں صدی کے وسط میں مولانا مودودیؒ ذہن ہندی کا مظہر بن کر ابھرے۔ مولانا کا اصل کارنامہ ذہنی وفکری (Intellectual) کارنامہ ہے۔ آپ نے اسلامی فکر کو بہت روشن کرکے پیش کیا۔ ان اعتراضات کا مسکت جواب دیا جو اسلام کے مختلف پہلوؤں پر علمی دنیا میں کئے جا رہے تھے۔ اسلام کا نظام فکر ترتیب دیا، اسلام پر فکری اعتماد بحال کیا۔ اور اسلام کو ایک زبردست نظریاتی قوت کے طور پر ابھارا۔

اسی زمانہ میں نطق اعرابی کی علامت بن کر مصر سے حسن البنا شہید ابھرے۔ شہید حسن البنا اور اس کے بعد سید قطب شہید کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پرزور کمیونکیشن کے ذریعہ پورے عالم اسلام کو متاثر کیا۔ اور عالم اسلام بالخصوص عالم عرب میں غلبہ اسلام کا ولولہ اور امنگ پیدا کی۔

بیسویں صدی کی اسلامی تاریخ دراصل اسی ذہن ہندی اور نطق اعرابی کے ظہور اور اثرات کی تاریخ ہے۔ ذہن ہندی مولانا مودودی کا علمی اور فکری کارنامہ، نطق اعرابی حسن البنا اور اخوان کا جذباتی کارنامہ، اس امتزاج نے عالم اسلام میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ اس نے پوری بیسویں صدی کو متاثر کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ستر اسی سال پہلے پڑھے لکھے مسلمان اسلام کا نام لیتے ہوئے شرماتے تھے اور آج ساری دنیا میں مسلمان ایک حیرت انگیز اعتماد سے سرشار ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے فکری و نظریاتی افق پر اسلام ایک بڑی قوت کی حیثیت میں بلکہ نظریاتی سپر پاور کی حیثیت سے ابھر رہا ہے۔ اس طرح ذہن ہندی اور نطق اعرابی کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ شکوہ ترکمانی کی پیشن گوئی پوری ہونا باقی تھا۔ اور یہ پیشن گوئی کچھ عرصہ بعد بیسویں صدی کے اواخر میں اس طرح پوری ہوئی کہ مرحوم نجم الدین اربکان شکوہ ترکمانی کی علامت بن کر ابھرے۔ اسلام کو ایک نئی طاقت اور نئی قوت انہوں نے دی اور رعب و دبدبہ پیدا کیا۔

پوری اسلامی تاریخ میں ترکوں کا ایک رول رہا ہے، ان کا ایک نمایاں کردار رہا ہے۔ اسلام کی شان و شوکت اور طاقت و قوت جس کو علامہ اقبال نے شکوہ کہا ہے، ترکوں نے اس میں اضافہ کیا۔

ترکی کی اسلام کے خیمہ میں واپسی، میرے خیال میں اکیسویں صدی کا سب سے بڑا واقعہ ہے اور اس واقعہ میں نجم الدین اربکان کا بہت کلیدی رول ہے۔ شکوہ ترکمانی کیا ہے؟ اس کو آپ محسوس کرنا چاہیں تو امریکی اور یورپی رسالوں کے ان بے شمار تجزیوں پر ایک نگاہ ڈال لیجئے جن میں نوعثمانیوں Neo Ottomans اور عثمانیوں کی واپسی The Return of Ottomans کی سرخیوں کے تحت خوف کا ظہار ہوتا ہے۔ شکوہ ترکمانی کو دیکھنا چاہیں تو یوٹیوب پر وہ ویڈیو دیکھ لیجئے جس میں ڈیوس کے اجلاس میں وزیر اعظم طیب اردوان اسرائیلی وزیر اعظم کی سخت سرزنش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اربکان کی مختصر سوانح

اربکان، بحر اسود کے کنارے ایک قصبہ سینب میں 1926 میں پیدا ہوئے، ان کا قوزان والئی خاندان ترکی کا ایک بہت ہی معزز خاندان ہے۔ عثمانی خلافت کے عہد میں

ترکی میں اس خاندان کے جج ہوا کرتے تھے۔شرعی عدالتیں تھیں،اور شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کی ذمہ داری ان ججوں کی تھی۔مرحوم اربکان کے والد،محمد صابری،ترکی خلافت کے آخری ججوں میں سے تھے۔ان کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

پیشہ اور تعلیم کے اعتبار سے نجم الدین اربکان ایک میکینکل انجینئر تھے۔انہوں نے استنبول یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد پوسٹ گریجویشن اور پی ایچ ڈی کے لیے جرمنی گئے۔جرمنی میں قیام کے دوران ڈیزل میکانکس میں،جو میکینکل انجینئرنگ کا ایک شعبہ ہے،آپ کے کام کی بڑی شہرت ہوئی۔اس میدان میں انہوں نے کافی کام کیا اور کئی نئے تصورات پیش کیے۔جرمنی سے واپسی کے بعد ترکی میں پہلی مرتبہ موٹر سازی کے لیے 1960 میں ایک آٹو موبائیل کارخانہ گومز موٹرز Gumus Motors قائم کیا۔۔ایک طرف ان کی ٹریننگ تھی،اور دوسری جانب ان کے تصورات تھے،جن کا آگے تذکرہ کیا جائے گا کہ ترکی کو معاشی اور صنعتی اعتبار سے خودکفیل ہونا چاہیے۔ ان تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے کام کی شروعات انہوں نے خود اپنے کیریئر سے کی اور بڑی تیزی سے صنعت اور کاروبار میں ترقی کرتے گئے۔بہت جلد اسوسی ایشن آف چیمبرز آف کامرس ترکی کے صدر منتخب ہوئے۔گویا ترکی میں صنعت اور کاروبار کی قیادت کا منصب حاصل کیا۔

اس زمانے میں ان کا نقشبندی سلسلے کے ایک بزرگ محمد زاہد کوٹکو سے رابطہ قائم ہوا۔محمد زاہد نے اس ذہین سائنسدان اور صنعت کار کے ذہن پر کافی گہرا اثر چھوڑا۔اب اربکان نے صنعتی ترقی اور ڈیزل میکانکس کے ساتھ ساتھ،احیائے اسلام کا خواب بھی دیکھنا شروع کیا۔چنانچہ اس زمانے میں انہوں نے ایک چھوٹا سا کتابچہ شائع کیا،جسے ملی گورش کہتے ہیں یعنی ملت کا وژن۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ترکی میں اسلام کے نام پر سیاست کرنا ناممکن تھا۔سخت گیر سیکولر آرمی کا نہایت سخت شکنجہ تھا۔کمال اتاترک نے بہت سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ اذان دینے،عربی زبان بولنے اور سیکھنے پر تک پابندی تھی۔وزیر اعظم عدنان میندریس نے ان پابندیوں کو نرم کرنا چاہا تو فوج نے ان کو سولی پر لٹکا دیا تھا۔عدنان مندریس کی پھانسی کے بعد اسلامی حلقے سخت خوف کی حالت میں تھے۔ان حالات میں ایک نوجوان صنعت کار کے لئے اسلام کا نام لینا آسان نہیں تھا۔

مرحوم اربکان نے اسلام کا نام لیے بغیر پورے وژن کو ملی گورش میں پیش کردیا۔ان کے خاص سلوگن تھے،اور آخری وقت تک یہ ان کی زبان پر رہے۔ایمان (یعنی ترکوں کو گہرا ایمان پیدا کرنا چاہیے)،کیندائن گوون (خود انحصاری،یعنی ترکی کو علم اور تہذیب کے معاملہ میں یورپ پر انحصار اور غلامی سے نجات پانا چاہیے)اگیر صنعائی (یعنی ترکی کو ہیوی انڈسٹریز قائم کرنی چاہیے اور یورپ پر معاشی انحصار ختم ہونا چاہیے) سعادت نظامی (یعنی ہماری قدریں ایک ایسے نظام کو جنم دیں گی جو خوشی اور سعادت کا موجب ہوگا)وغیرہ۔ اس زمانہ میں وہ راست دین کا نام لے کر سیاست نہیں کرسکتے تھے،چنانچہ ایک اصطلاح سعادت نظامی وضع کی۔ایک ایسا نظام جس میں ہر کسی کو خوشی ملے۔اس طرح انہوں نے اسلام کا راست نام لیے بغیر پوری اسلامی فکر پیش کی۔ملی گورش کے ڈاکومنٹ موجود ہیں۔ان کو پڑھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی جانب اشارہ ہے۔اسلام لانا چاہتے ہیں،لیکن دستوری اور قانونی رکاوٹوں کے سبب انہوں نے اسلام کا نام نہیں لیا۔ملت ان کا بنیادی سلوگن تھا۔اس کا انہوں نے خوب استعمال کیا،اس طرح مختلف سلوگنز کا استعمال کرتے ہوئے انہوں نے ترکی کے تعلق سے اپنا وژن تیار کیا اور اسے اس طرح پیش کیا کہ ان کے مخاطب صاف صاف سمجھ گئے کہ مقصود اسلام کا احیا ہے۔انہوں نے ملی گورش میں ترکی کی مطلوب معاشرت،تہذیب،اس کی سیاست،خارجہ پالیسی،عالمی تناظر میں اس کا کردار،ان سب کے بارے میں اپنے خیالات پیش کئے۔اسی ملی گورش کی اساس پر ایک زبردست عوامی تحریک ملی گورش ہی کے نظام سے برپا کی۔بعد میں انہوں نے کئی پارٹیاں قائم کیں لیکن ملی گورش مادر تنظیم Mother Movement کی حیثیت سے برقرار رہی اور آج بھی برقرار ہے۔

۱۹۶۹ میں اربکان نے قونیہ سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑا اور رکن پارلیمان (ڈپٹی) منتخب ہوئے۔ایک سال بعد انہوں نے پہلی سیاسی پارٹی قائم کی جس کو ملی نظام پارٹیسی' National Order Party کہا جاتا ہے۔ اس پارٹی کے بعض ممبر آف پارلیمنٹ منتخب ہوئے،لیکن جیسے ہی اس نئی پارٹی کے رجحانات کا اندازہ سخت گیر فوج کو ہوا،قیام کے ایک سال کے اندر اس پر پابندی لگا دی گئی۔اسے خلاف دستور قرار دیا گیا اور اثاثہ جات ضبط کئے گئے۔

اکتوبر 1972 میں اربکان نے فوراً ہی دوسری پارٹی 'ملی سلامت پارٹیسی' National Salvation Party قائم کی۔جنوری 1974 میں الیکشن میں حصہ لیا۔ 12 فیصد ووٹ ملے۔اور 48 ایم پی منتخب ہوئے۔نئی مشترک حکومت میں اربکان بحیثیت نائب وزیر اعظم شریک ہوئے۔اربکان کے اس اقدام کو ان کی پارٹی کے بعض افراد نے پسند نہیں کیا۔خود ان کے مرشد محمد زاہد کوٹکو نے بھی یہ پسند نہیں کیا کہ اسلام مخالف جماعتوں کے ساتھ اشتراک کیا جائے۔لیکن اربکان کے ذہن میں احیائے اسلام کا ایک طویل المیعاد منصوبہ تھا اور اس منصوبہ کی تعمیل کی سمت آگے بڑھنے کے لئے انہیں ایک موقع مل رہا تھا۔انہوں نے ان تنقیدوں کی پروا کئے بغیر اپنا سفر جاری رکھا اور ایک سال نائب وزیر اعظم رہے۔اس ایک سال کے مختصر عرصہ میں انہوں نے تین اہم کام کئے۔جس نے بعد کے زمانے میں ترکی کی سیاست پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔پہلا کام تو یہ کیا کہ اگیر صنعائی (ہیوی انڈسٹریز کے ذریعہ ترکی کو خودکفیل بنانے کی پالیسی) کے اپنے وژن کو روبعمل لایا۔وہ سمجھتے تھے کہ صنعت وحرفت اور معیشت میں یورپ پر انحصار کم ہوگا تو یورپ

کے تہذیبی اثرات کا مقابلہ کرنا اور اسلامی تہذیب کے احیا کی کوشش کرنا آسان ہوگا۔ چنانچہ عین نوجوانی میں انہوں نے خود کارخانہ قائم کرکے اس عمل کی شروعات کی تھی، اب یہ کام حکومتی سطح پر ہونے لگا۔ نتیجتاً کافی صنعتی ترقی ہوئی۔ آج ترکی کے پاس جو صنعت ہے، اربکان کے مخالفین بھی مانتے ہیں کہ اس میں بڑا کردار اس زمانے کی اربکان کی پالیسیوں کا ہے۔ دوسرا کام، سیکولر لابی کے اثرات کو کم کرنے کا تھا۔ اربکان نے اس مختصر عرصہ کی کوششوں کے ذریعہ میڈیا، بیوروکریسی وغیرہ میں اپنے ہمدرد پیدا کرلئے اور اپنے اگلے سفر کے لئے راہوں کو کچھ ہموار کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ پہلے تو اسلام کے نام پر پابندی تھی، سخت گرفت کی جاتی تھی اور گرفت اب بھی ہے لیکن کسی نہ کسی درجہ میں اس کے اندر کمزوری آئی۔ تیسرا بڑا کام اقتصادی ہے۔ آج بزنس اسٹڈیز اور اکنامکس میں ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے اناطولیائی شیر Anatolian Tigers۔ اس سے مراد ترکی کے دیہی ایشیائی علاقوں (جنہیں اناطولیہ کہا جاتا ہے) سے آنے والے وہ متوسط اور غریب طبقات کے لوگ ہیں جنہوں نے اربکان کی پالیسیوں کے نتیجہ میں تیز رفتار تجارتی اور صنعتی ترقی کی اور ترکی کی معیشت کا ایک اہم عامل بن کر ابھرے (اناطولین ٹائیگرز کے اس پورے پروسیس کو آج بزنس اسٹڈیز اور پالیسی اسٹڈیز میں ایک اہم کیس کے طور پر پڑھایا جاتا ہے)۔ صنعت وحرفت کو محدود اشرافیہ کے تسلط سے نکالنا اور صنعتی ترقی کے ثمرات غریب دیہی آبادی تک پہنچانا عین اسلامی وژن کا تقاضا تھا۔

اربکان ایک سال نائب وزیر اعظم رہے۔ اس کے بعد کمال اتاترک کی وفادار فوج پھر حرکت میں آگئی۔ اربکان اقتدار سے برطرف ہوئے۔ پھر پارٹی پر پابندی لگی اور اثاثہ جات ضبط ہوئے۔ اربکان نے کچھ دن انتظار کیا اور یہ مجاہد پھر ایک نئی پارٹی لے کر میدان میں آگیا۔ 1980 میں انہوں نے رفاہ پارٹیWelfare Party کی بنیاد ڈالی اور یہ تیسری پارٹی تھی۔

اب اربکان کی تحریک تنظیموں کے ایک بڑے قبیلہ میں بدل چکی تھی۔ ملی گورش کے سائے میں خواتین کی، تاجروں کی MÜSIAD (Independent Industrialists' and Businessmen's Association)، طلبہ کی، صنعت کاروں MESDER (Independent Traders' and Artisans' Association)، حقوق انسانی کے جہد کاروں کی IHD (Human Rights' Association) کی، غرض زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہونے والی بے شمار تنظیمیں قائم ہوچکی تھیں۔ رفاہ پارٹی نے اس دوران میونسپلٹی کے الیکشن میں حصہ لیا اور استنبول کے میئر موجودہ وزیر اعظم رجب طیب اردوان منتخب ہوئے۔ ان کو کارپوریشن میں اپنے جوہر دکھانے کے خوب مواقع ملے۔ کارپوریشن کو اردوان نے ایک نیا تصور دیا۔ استنبول کی کارپوریشن صرف صفائی ستھرائی اور سڑکوں اور موریوں کا کام ہی نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کارپوریشن نے استنبول میں بڑی تعداد میں ہجرت کرنے والوں کے روزگار کا انتظام کیا۔ ان کی رہائش، علاج معالجہ کا انتظام کیا۔ اور ثابت کردکھایا کہ کارپوریشن بھی ایک ویلفیر انسٹی ٹیوشن بن سکتی ہے۔ ایک وقت آیا کہ ان کو اقوام متحدہ نے دنیا بھر کی بہترین میونسپل کارپوریشن کا ایوارڈ دیا۔

اس ماڈل نے پورے ترکی کو متاثر کیا۔ 1996 کے الیکشن میں 550 میں 158 رفاہ پارٹی کے ممبران پارلیمنٹ منتخب ہوئے۔ اور رفاہ پارٹی پارلیمنٹ میں سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری۔ اور اربکان ملک کے وزیر اعظم بنے۔

اربکان کی یہ مدت بھی بہت مختصر رہی لیکن ایک سال کی مختصر مدت میں دیگر کاموں کے ساتھ ایک بڑا کارنامہ انہوں نے انجام دے ڈالا۔ فوجی حکمراں یورپ سے قربت چاہتے تھے، اربکان عالم اسلام میں ترکی کے ماضی کے قائدانہ رول کی بحالی چاہتے تھے۔ انہوں نے ترکی کی خارجہ پالیسی کو ایک بڑا موڑ دیا۔ آٹھ بڑے اسلامی ممالک، ایران، ملیشیا، پاکستان، بنگلہ دیش، انڈونیشیا، نائیجیریا اور مصر کو لے کر ڈیولپنگ 8 کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ ایک سال بعد فوجی دباؤ کے تحت ان کی وزارت عظمی چھین گئی۔ اگر اربکان کو موقع ملتا تو وہ ان آٹھ ممالک کو لے کر یورپی یونین کی طرح ایک مشترک منڈی کا قیام چاہتے تھے۔ عالم اسلام کا یہ اتحاد یقیناً ہمارے عہد کا بہت بڑا واقعہ ہوتا۔

جنوری 98 میں پانچ سال کے لیے ان کے سیاست میں حصہ لینے پر پابندی لگادی گئی۔ کچھ عرصہ انہیں جیل میں بھی رکھا گیا۔ 2001 میں رہا ہوکر آئے، اس دوران ان کی پارٹی میں اختلاف ہوا اور جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی اردوان کی قیادت میں تشکیل دی گئی اور اربکان نے سعادت پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ اردوان کی عدالت وکل کنما پارٹیسی (Justice and Development Party) ایک الگ پارٹی ضرور ہے لیکن اس کی اصل دھارا ملی گورش ہی ہے اور اس کے سارے بڑے قائدین اربکان کے تربیت یافتہ اور ان کے راست شاگرد ہیں۔ 2007 کے انتخاب میں اس پارٹی کو 550 میں 334 سیٹیں ملیں۔ اس طرح جس ترکی میں پچاس سال پہلے اسلام کا نام لینے پر وقت کے وزیر اعظم کو سزائے موت ہوئی تھی، اسی ترکی میں اسلام پسندوں کی سیاسی پوزیشن، سارے عالم اسلام اور سارے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے۔ آدھی سے زائد میونسپلٹیاں ان کے زیر تسلط ہیں اور تقریباً دوتہائی پارلیمنٹ کی سیٹوں پر ان کا قبضہ ہے۔ یہ موقف کسی اور ملک میں اسلام پسندوں کو حاصل نہیں ہے۔

اربکان کا کارنامہ

میرا خیال یہ ہے کہ اربکان کے کارنامہ کے تین بڑے عنوان ہیں۔

1) شخصیت وقیادت سازی

2) حوصلہ، ہمت و پامردی

3) تدبیر وفراست

شخصیت وقیادت سازی: کسی نظریاتی سیاسی تحریک کی کامیابی کے لئے تین چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔اول، کیڈر یعنی ایسے جانثار وابستگان جو مضبوط تنظیمی بندھن میں بندھے ہوں اور تحریک کے لئے سب کچھ کر گذرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔دوم، قدآور اور مدبر قیادت جو اس کیڈر کی قوتوں اور توانائیوں کا صحیح استعمال کرسکے اور نئے حالات میں نئی راہیں نکال سکے اور سوم، عوامی نفوذ یعنی وابستگان کے محدود دائرہ کے باہر عوام الناس میں نفوذ ان کی حمایت، تائید اور محبت۔ایک مغربی تجزیہ نگار نے اسلامی تحریکوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ تحریکیں کیڈر سازی میں بہت کامیاب ہیں۔ ہر جگہ ان کے پاس مستحکم تنظیمی نیٹ ورک اور وفادار کیڈر موجود ہے۔عوامی نفوذ میں یہ تحریکیں کہیں کامیاب ہیں اور کہیں ناکام۔تجزیہ نگار کے مطابق ان کی بڑی ناکامی قیادت سازی کے عمل میں ناکامی ہے۔صف اول کے قائدین کے بعد وہ ایسے قدآور لیڈروں کی دوسری اور تیسری سطح تیار نہیں کر پائے جو اپنی تدبیر وفراست کے ذریعہ ان تحریکوں کے مشن کو آگے بڑھا سکیں اور صف اول کے قائدین کے چھوڑے ہوئے کام کو اسی حکمت، دانشمندی، اور اجتہادِ فکر کے ساتھ ترقی دے سکیں۔

دنیا کی دیگر تحریکوں کے سلسلہ میں یہ تجزیہ کس حد تک درست ہے، اس پر بحث ہوسکتی ہے۔لیکن کم از کم اربکان کی تحریک کے سلسلہ میں وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تجزیہ درست نہیں ہے۔اربکان کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ آج وہ رخصت ہوئے تو انہوں نے ترکی میں کوئی بہت بڑا خلا نہیں چھوڑا۔ان کے شاگردوں کی قائدانہ صلاحیتوں کی ساری دنیا معترف ہے۔اور ان کے جانے کے بعد بھی ان کا مشن اسی شان وشوکت کے ساتھ جاری ہے۔

اربکان کو ان کے احباب محبت سے 'ہوجا' (یعنی استاد یا مرشد) کہتے تھے۔اور وہ سچ مچ ایک بے مثال ہوجا تھے۔وہ زندگی بھر ترکی کے سخت گیر سیکولر معاشرہ میں نوجوانوں کو جمع کرتے رہے اور ان کی صلاحیتوں کو چمکا کر انہیں ناقابل تسخیر لیڈروں میں بدلتے رہے۔آج ان کے شاگرد نہ صرف ترکی کی سیاست پر بلکہ دنیا کے سیاسی منظر نامہ پر چھاتے جارہے ہیں۔وزیر اعظم طیب رجب اردوان کو اربکان نے بڑی شفقت ومحبت سے پروان چڑھایا۔جب وہ استنبول کے میئر بنے تو اربکان انہیں سلطان فاتح (جس نے پہلی دفعہ قسطنطنیہ فتح کیا تھا۔اور قسطنطنیہ کا ہی موجودہ نام استنبول ہے) کہنے لگے۔آج اردوان کی قائدانہ صلاحیتوں کی ساری دنیا معترف ہے۔مغربی تجزیہ نگار انہیں ایک ایسے طاقتور قائد کے روپ میں دیکھتے ہیں جو مغرب اور یورپ کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ٹائم میگزین نے کئی دفعہ انہیں دنیا کے بااثر ترین قائدین کی فہرست میں شامل کیا ہے۔اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں نے انہیں کئی ایوارڈز دیئے ہیں۔اربکان کے باصلاحیت شاگردوں میں اردوان اکیلے نہیں ہیں۔اس وقت ترکی میں اسلام پسندوں کے پاس اعلی درجہ کے قائدوں کی ایک پوری کہکشاں موجود ہے۔ترکی کے صدر عبداللہ گل، نائب وزیر اعظم بلند ارنچ، سابق نائب وزیر اعظم عبدالطیف سینیر یہ سب عالمی سطح کے قائدین ہیں۔ترکی کے موجودہ وزیر خارجہ احمد داود لو، کو 'فارین پالیسی جرنل' نے ان قائدین میں سے ایک قرار دیا ہے جو عالمی ڈپلومیسی کا منظر نامہ بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔نوعثمانیت (Neo Ottomonism) یعنی ترکی کے ذریعہ اسلامی دنیا کو قیادت فراہم کرنا اور عالم اسلام کے مسائل حل کرنا، اور زیرو پرابلم فارین پالیسی Zero Problem Foreign Policy کی ان کی تھیوری اس وقت ساری دنیا میں موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔انہیں مشرق کا ہینری کیسینجر کہا جارہا ہے۔(ہینری کیسینجر امریکہ کا وزیر خارجہ تھا اور اس نے امریکہ کی خارجہ پالیسیوں کو مخصوص رخ دے کر عالمی سیاست پر گہرا اثر ڈالا تھا۔) یہ سب وہ لوگ ہیں جنہیں اربکان نے بڑی محبت، صبر، اور عالی ظرفی کے ساتھ تیار کیا۔کل ترکی کی پارلیمنٹ میں تعزیتی نشست میں ان قائدین نے جو تقریریں کی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اربکان نے کس طرح نوجوانوں پر اعتماد کیا۔ان کو آزادانہ رائے رکھنے، تجربات کرنے اور خود اربکان سے اختلاف کرنے کا حق دیا۔وزیر اعظم اردوان کی پالیسیوں سے آخر عمر میں اربکان کو اختلاف رہا۔وہ ان پر سخت تنقید کرتے رہے لیکن خود اردوان کہتے ہیں کہ تنقید کے ساتھ ساتھ وہ ان کی برابر رہنمائی بھی کرتے رہے۔اور ان کی خوبیوں کا عوام میں بھی اعتراف کرتے رہے۔سلطان فاتح کا لقب اس اختلاف کے زمانے میں بھی دہراتے رہے۔یہ عالی ظرفی قیادت سازی کے عمل کی بنیادی ضرورت ہے۔اربکان کے شاگردوں کی یہ کہکشاں صرف سیاست تک محدود نہیں ہے۔تجارت و صنعت میں آج ترکی کے کئی بڑے نام، ملی گورش اور اربکان کے تربیت یافتہ ہیں۔مضبوط تنظیم، اور عوامی رسوخ کے ساتھ قیادت سازی میں کامیابی اربکان کی کامیابیوں کا اصل راز ہے۔اور یہ تحریکات اسلامی کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔

حوصلہ، ہمت و پامردی

1960 کے ترکی پر نظر ڈالیے، وہاں اسلام کا نام لینا بھی ایک جرم تھا۔جیسا کہ عرض کیا گیا یہ وہی سال تھا جس میں وزیر اعظم عدنان میندریس کو اسلامی رجحان رکھنے کے

جرم میں پھانسی دے دی گئی تھی۔ان حالات میں ایک 34 سالہ نوجوان اگر اسلام کے نام پر ایک تحریک بپا کرتا ہے تو اس کے حوصلہ، ہمت اور شجاعت کی کیا کیفیت رہی ہوگی، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جراءت و ہمت درویشوں، اساتذہ، مذہبی قائدین، وکیلوں اور صحافیوں میں ہوتی ہے۔ انگریزی زبان میں ایک مستقل اصطلاح ہے، Middle Class Cowardice مڈل کلاس بزدلی۔یعنی مڈل کلاس جس کے کیریر اور پروفیشن کو لے کر اپنے عزائم ہوتے ہیں، بزدل ہوتی ہے۔کسی قائم نظام کو چیلنج کرنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔آپ دیکھئے کہ اربکان نہ تو درویش تھے نہ ٹیچر، وہ وکیل اور صحافی بھی نہیں تھے۔وہ ایک کامیاب انجنیر اور صنعت کار تھے۔عین نوجوانی میں ڈیزل میکانکس کے کامیاب سائنسدان کی حیثیت سے ان کی شہرت ہو چکی تھی۔ترکی کی صنعت کے موجد اور کامیاب صنعت کار کی حیثیت سے بھی ان کا مقام تسلیم کرلیا گیا تھا۔گویا ہر اعتبار سے وہ ایک Middle Class Icon تھے۔

لیکن اس نوجوان صنعت کار کی جانب سے 1960 کے ترکی میں اسلام کے نام پر ایک تحریک بپا کرنا اور اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانا بلاشبہ جراءت، حوصلہ،، ہمت، خود اعتمادی، توکل، آہنی عزم اور فولادی ارادہ کی لازوال مثال ہے۔

پھر، آپ دیکھئے کہ اربکان کو پانچ دفعہ نئی پارٹیاں قائم کرنی پڑیں۔انتخابات جیتنے کے بعد بھی ان کی پارٹی پر پابندی لگائی جاتی رہی۔اثاثہ جات ضبط کئے گئے۔پابند سلاسل کیا گیا۔ایسے حالات میں تحریکوں میں دو طرح کا منفی ردعمل پیدا ہوتا ہے۔یا تو تحریکیں تعطل کا شکار ہو جاتی ہیں۔قائدین یورپ اور امریکہ میں پناہ گزیں بن جاتے ہیں۔کیڈر منتشر ہو جاتا ہے اور تحریک تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔یا پھر تحریکیں تشدد اور انتہا پسندی کے راستہ پر نکل جاتی ہیں۔اس سے بھی ان کے دشمنوں کو انہیں بدنام کرنے اور ختم کرنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔دونوں راستے خودکشی کے راستے ہیں۔اور بے صبری کی پیداوار ہیں۔لیکن بدقسمتی سے سخت گیر حالات میں انسان بہت زیادہ صبر نہیں کرسکتا اور ان راستوں کو اختیار کرکے تباہی کا سامان پیدا کرتا ہے۔

یہ اربکان ہی کا حوصلہ و ہمت ہے کہ ان پر بار بار پابندیاں لگتی رہیں۔وہ ہر بار صبر کا پہاڑ بنے رہے۔اور دونوں غلط راستوں سے خود کو محفوظ رکھا۔ پابندیاں لگیں، اثاثے ضبط ہوئے۔لیکن اس مرد حق پرست نے ہر بار ہنستے کھیلتے پھر ایسی نئی شروعات کی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ان کا آشیانہ بار بار جلتا رہا اور ہر بار وہ نئے حوصلہ کے ساتھ تنکہ تنکہ جمع کرکے نیا آشیانہ تعمیر کرتے رہے۔اس حوصلہ اور صبر کا نتیجہ آج سامنے ہے۔اور ساری دنیا اربکان کی ہمت کو سلام کررہی ہے۔

تدبیر و فراست

اس میں کوئی شک نہیں کہ اربکان مولانا مودودی اور اخوان سے متاثر تھے۔اور ان کی تحریک اسی فکری دھارا کا حصہ تھی۔لیکن ان کو جو ماحول میسر آیا تھا وہ بالکل مختلف تھا۔مصر اور ہندوستان میں ایک لمبے عرصہ تک اسلامی قوانین نافذ رہے تھے۔ بیرونی استعمار نے ان ممالک پر قبضہ کرکے یہاں اسلامی قوانین کو منسوخ کیا تھا۔جب مولانا مودودی اور حسن البنا نے اپنی تحریکیں شروع کیں تو استعمار کا زور کم زور پڑ چکا تھا۔اس کا چل چلاو تھا اور یہ سوال تھا کہ اس کے جانے کے بعد مصر اور پاکستان میں کونسا نظام نافذ رہے گا؟ اس دور میں مکمل اسلامی انقلاب کی دعوت اور فوری نظام کی مکمل تبدیلی کا مطالبہ عین حالات کے مطابق تھا۔ان تحریکوں کو ایک کھلی زمین مل رہی تھی اور وہ فطری طور پر وہاں اسلامی نظام کا پیڑ لگانے کے خواہشمند تھے۔

ترکی کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔وہاں یہ سوال ہی نہیں تھا کہ ترکی میں کونسا نظام ہو؟ اتاترک نے چالیس سال قبل استبدادی سیکولر نظام قائم کیا تھا۔اور اس کی جڑیں بہت گہری تھیں۔نظام کی فوری تبدیلی کا کوئی امکان نہیں تھا۔اربکان کو پہلے اس تناور درخت کی جڑوں کو کاٹنا تھا جس کی جڑیں زمین میں بہت گہرائی تک اتر چکی تھیں۔اس کے بعد ہی وہاں اسلامی نظام کے پودے کو بونے کا تصور کیا جاسکتا تھا۔اربکان نے ان حالات میں وہی کیا جو فراست مومن کا تقاضہ تھا۔انہوں نے اسلام کے تدریج کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے بتدریج حالات کو متاثر کرنے اور فوری اسلامی انقلاب کا نعرہ بلند کرنے کی بجائے حکمت و فراست کے ساتھ بتدریج اس کی طرف پیش رفت کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس کے نتیجہ میں ایک بالکل مختلف حکمت عملی سامنے آئی۔آج یہ حکمت عملی دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کو متاثر کررہی ہے۔اس لئے کہ آج دنیا کے کئی ممالک میں اسلامی تحریکوں کو کم و بیش ویسے ہی حالات کا سامنا ہے جیسے ترکی میں تھے۔یعنی ہر جگہ ایک نظام موجود ہے۔اس کی جڑیں موجود ہیں۔فوری نظام اسلامی کا قیام ممکن نہیں۔اور تدریج کے ساتھ آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔اس لئے اربکانی ماڈل کے مختلف اجزا اسلامی تحریکیں قبول کررہی ہیں۔اسے شلزے جیسے مغربی مصنفین پوسٹ اسلامزم کہہ رہے ہیں۔اس اصطلاح سے اتفاق ممکن نہیں ہے۔ہم اس کو 'اربکانی ماڈل' کہیں گے۔اربکانی ماڈل کی کچھ اہم خصوصیات ذیل کے مطابق ہیں۔

۱۔مکمل انقلاب کے نعرہ سے کام کی شروعات کرنے کی بجائے تدریجی عمل اختیار کرنا۔اورحتمی نصب العین پر نگاہ رکھنے کے ساتھ آج کے حالات میں ممکنہ تندیلی پر فوکس کرنا۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں۔

> ''ہم اپنی تحریک خلا میں نہیں چلا رہے ہیں، بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں۔اگر ہمارا مقصد محض اعلان واظہار حق ہوتا تو ہم ضرور صرف بے لاگ حق بات کہنے پر اکتفا کرتے۔لیکن ہمیں چونکہ حق کو قائم کرنے کی کوشش کرنی ہے اوراس کی اقامت کے لئے اس واقعات کی دنیا میں سے راستہ نکالنا ہے۔اس لئے ہمیں نظریت اور حکمت عملی کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے چلنا پڑتا ہے۔آئیڈیلیزم کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اپنے آخرمقصود کو نہ صرف خود پیش نظر رکھیں بلکہ دنیا کو بھی اسکی طرف بلاتے اور رغبت دلاتے رہیں۔اور حکمت عملی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اپنے مقصود کی طرف بتدریج بڑھیں اور واقعات کی دنیا میں ہم کو جن حالات سے سابقہ ہے اس کو اپنے مقصود کی سمت موڑنے،اس کے لئے مفید بنانے اور مزاحمتوں کو ہٹانے کی کوشش کریں۔اس غرض کے لئے ہمیں اپنے آخری مقصود کے راستے میں کچھ درمیانی مقاصد اور قریب الحصول مقاصد بھی سامنے رکھنے ہوتے ہیں۔تاکہ ان میں سے ایک ایک کو حاصل کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے جائیں۔''

اربکانی ماڈل کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ''درمیانی مقاصد'' اور''قریب الحصول مقاصد'' پر توجہ دینے کا شعور پیدا کیا۔اس نے یہ شعور پیدا کیا کہ اقامت دین کی منزل کا راستہ عدل وانصاف کے پڑاو (یا مولانا مودودی کے الفاظ میں درمیانی مقاصد اور قریب الحصول مقاصد) سے ہوکر گذرتا ہے۔دارالاسلام کی منزل کا راستہ دارالامن کے پڑاو سے ہوکر گذرتا ہے۔اس لئے ان قریب الحصول مقاصد کی فکر کرنا اسلامی تحریک کا عین تقاضہ ہونا چاہیے۔

۲۔اسلام اور اسلامی قدروں کی سمت جس حد تک پیش رفت ممکن ہو، کرتے جانا۔مکمل انقلاب کے انتظار میں ممکنہ جزوی تبدیلی سے صرف نظر نہ کرنا۔اس لئے کہ تبدیلی تدریج کے ساتھ ہی اور جزء بہ جزء ہی آتی ہے۔یہ وہی فارمولہ ہے جسے ابن القیم الجوزی نے السیاسة الشرعیة میں 'اقرب الی الصلاح او ر ابعد عن الفساد'' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔یعنی اسلامی سیاست وہ ہے جس کے نتیجہ میں معاشرہ صلاح سے قریب تر آئے اور فساد سے بعید تر ہو جائے۔سارا اسلام نافذ کرنا آج ممکن نہیں لیکن آج حجاب کی اجازت حاصل کر لینا ممکن ہے تو یہ حاصل کر لینے کی کوشش کرنا اور اس کے لئے قوت حاصل کرنا عین اسلامی سیاست ہے۔اسلام کے حدود وتعزیزات کا نفاذ ممکن نہیں لیکن عدل و انصاف کے اسلامی معیارات کی سمت ایک دو قدم آگے بڑھنا ممکن ہے تو اسلامی سیاست یہ ہے کہ قدم آگے بڑھائے جائیں۔ مکمل انقلاب کے انتظار میں ممکنہ صالح تبدیلی کے موقع کو گنوانا مناسب نہیں ہے۔یہ اربکانی ماڈل ہے۔

۳۔ٹکراو کے بجائے مفاہمت کے ساتھ آگے بڑھنا۔اسلام کی مخالف طاقتوں کے ساتھ بھی معاہداتی سیاست کے ذریعہ کسی خیر کا حصول ممکن ہو تو (مدینہ کے یہودی ومشرک قبائل اور مکہ میں بنو ہاشم کے ساتھ اشتراک کے اسوہ کی روشنی میں) تو اس موقع کو نہ گنوانا۔

۴۔اسلام کا نام لینا ممکن نہ ہو تو اسلامی تعلیمات اور شریعت کے مقاصد کو ہدف بنانا۔اور ایسے حالات پیدا کرنا کہ بعد میں اسلام کے نام پر بھی سیاست ممکن ہو۔

۵۔خدمت خلق اور عوامی مسائل کے حل کے ذریعہ سماجی قوت حاصل کرتے جانا اور اس سماجی قوت کو سیاسی قوت کا ذریعہ بنانا۔خدمت خلق کے ادارے، محاذی تنظیمیں اور عوامی مسائل میں بھرپور شرکت تحریکات کو عملی شہادت حق کا موقع بھی فراہم کرتی ہیں،عوام میں ان کے نفوذ کو بڑھاتی ہیں اور ان کی سماجی قوت میں اضافہ کا ذریعہ بنتی ہیں۔

آج یہ اربکانی ماڈل ساری دنیا کی اسلامی تحریکات کی توجہات کا مرکز بنا ہوا ہے۔اور اس ماڈل کی بہت سی خصوصیات تحریکیں قبول کرتی جا رہی ہیں۔

اللہ اربکان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ان کی لغزشوں کو درگذر فرمائے اور ہم سب کو ان کی تمام اچھی باتوں کی اتباع کی توفیق عطا فرمائے آمین۔